محمد خاور نوازش

پریم چند کی فکر کے چند پہلو---- مکاتیب کی روشنی میں

بیسویں صدی میں مغرب کی نئی تنقیدی تھیوریز کو جب مشرق میں اہمیت حاصل ہوئی اور اُردو کے ناقدین نے متن فہمی کے جدید طریقوں سے شناسائی حاصل کرنے کی کوشش کا آغاز کیا تو اس پہلو کی طرف توجہ مفقود ہوگئی کہ کسی ایک خطے کی شعریات کا دوسرے خطے کے ادب پر جوں کا توں اطلاق ممکن نہیں۔ نتیجتاً اس نوع کی تنقیدی بصیرت کے حامل ناقدین غالبؔ کی مکتوب نگاری یا آزادؔ کی انشاء پردازی پر بات کرنے سے بھی پہلے مغرب کے عطا کردہ نئے تنقیدی نظریات کی روشنی سے ذہن کا منور ہونا ضروری سمجھنے لگے جس کے باعث مشرق کے ادبی سرمائے کا وہ مخصوص ذخیرہ جو اپنے اندر وسیع تر امکانات لیے ہوئے تھا اُس پر بھی یہ سوالیہ نشان ثبت ہوا کہ آیا یہ ادب کی کوئی صنف شمار ہوگا؟ اور پھر نئی شعریات کے تناظر میں اُس ذخیرے کو ایک فن کا نام دے دیا گیا جس پر کسی تحریر کی ادبی اہمیت کی عمارت کھڑی ہوسکتی ہو۔ اس فن کے تنقیدی برتاؤ سے تشکیل پانے والی تحریر کو ایک مخصوص 'صنف' کا نام نہیں دیا گیا اور آج اس ذخیرے کے دیگر ادبی اصناف کے مقابل محدود رہ جانے اور اس کی طرف رجحان کے فقدان کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ مذکورہ فن مکتوب نگاری کا فن ہے۔

کسی بھی ادیب کی جذباتی زندگی، افکار و تصورات اور میلانات کا بھرپور اور بے ساختہ اظہار جس قدر اُس کے خطوط میں ہوتا ہے وہ دیگر اصناف میں نہیں ہوسکتا۔ جدید علوم نے جب کسی فن کار کے فن کو اُس کی شخصیت اور ماحول کے تناظر میں سمجھنے کا قرینہ سکھایا تو مکاتیب سے دل چسپی کے عنصر نے جنم لیا۔ آغاز میں اس نوع کی تحاریر کو کسی بھی شخصیت کی داخلی زندگی کے حوالے سے بنیادی معلومات حاصل کرنے میں معاون کی حیثیت حاصل رہی لیکن جوں جوں مکاتیب کے ذخائر میں اضافہ ہوتا گیا اور اُن میں ادیبوں کی معاصر سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کی جھلک دکھائی دینے لگی تو ان کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی۔ اس ضمن میں غالبؔ کے مکاتیب کو سب سے پہلے پذیرائی حاصل ہوئی۔ اُس دور کے ناقدین کے ذہن میں یہ خیال بالکل نہیں ہوگا کہ مستقبل قریب میں نئی تنقیدی تھیوریز مصنف کی شخصیت اور ماحول کو منہا کر کے متن کو بنیادی اہمیت سہم کنار کریں گی اور مغرب کی تقلید میں متن اساس شعریات کو تقویت حاصل ہوگی۔ مکتوب نگاری کی روایت پر ناقدینِ ادب کافی کچھ لکھ چکے ہیں لہٰذا یہاں غالبؔ سے لے کر احمد ندیم قاسمی تک مختلف شعرا و ادبا کے فن مکتوب نگاری پر بات کرنا مقصود نہیں البتہ اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مکاتیب کو افسانوی اور غیر افسانوی ادب کی بہت سی اصناف کی طرح خواہ ایک باقاعدہ صنف کا درجہ نہیں دیا جاسکا لیکن کسی بھی ادیب کے فن پاروں اور یہاں تک کہ خود نوشت داستانِ حیات پر بھی داخلی اور خارجی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے وہ کامل بھروسہ نہیں کیا جاسکتا جو مکاتیب کا خاصا ہے کیوں کہ خط لکھتے وقت مکتوب نگار کا مخاطب، ناظر یا قاری فقط مکتوب الیہ ہوتا ہے' ایک ایسا شخص جسے وہ پہچانتا ہے اور اکثر اوقات یہ مکتوب نگار کا بہت قریبی ہوتا ہے۔ فن پارہ یا خود نوشت ایسی تحریریں بہر صورت شعوری کاوش کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ ایک مخصوص فرد کے لیے نہیں بلکہ کسی بھی انجان قاری کے سامنے پیش کرنے کے لیے تخلیق کی جاتی ہیں گویا ان میں مصنف کے زاویہ نظر کا نسبتاً مختلف ہونا بہر صورت بعید از امکان نہیں۔ بقول سید مظفر حسین برنی:

''اصنافِ ادب میں سب سے اہم اور معلوم شخصیت خود لکھنے والے کی ہوتی ہے، اُسے یہ علم نہیں ہوتا، کہ اُس کے مخاطب کون ہیں؟ نہ زمان و مکاں سے اُن کا رشتہ ثابت ہوتا ہے، نہ لکھنے والے کو اُن کی سطحِ فہم و ادراک کا علم ہوتا ہے۔ ایک نظم یا ادبی شہ پارہ پڑھنے والے آج بھی ہو سکتے ہیں' اور ہزار سال بعد بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح قارئین کے ساتھ اُن کا ماحول بھی تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے' لیکن خطوط کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس میں کاتب اور مکتوب الیہ دونوں معلوم ہیں، اُن کا رشتہ بھی زمان و مکاں کے ساتھ جڑا ہوا ہے' وہ ایک مخصوص ماحول میں زندہ ہیں اور اُن کی گفتگو بھی معلوم حقائق سے متعلق ہے۔ کاتب اور مکتوب الیہ کی سطحِ ادراک ایک بھی ہو سکتی ہے' مختلف بھی۔ اس کے موضوعات قطعاً نجی اور ذاتی بھی ہو سکتے ہیں' قومی اور عالمگیر بھی۔ ان خطوط کا محرک عداوت بھی ہو سکتی ہے' عقیدت و محبت بھی۔ کاتب اور مکتوب الیہ کا رشتہ رسمی اور کاروباری بھی ہو سکتا ہے اور اس کی جڑیں لکھنے والے کی ذات میں بہت گہری بھی ہو سکتی ہیں۔''[1]

انیسویں صدی میں غالبؔ کے علاوہ سرسید، شبلی، حالی اور آزاد ایسی شخصیات ہیں جن کے مکاتیب کو پذیرائی حاصل ہوئی جبکہ بیسویں صدی میں اکبرالہٰ آبادی، مولوی عبدالحق، علامہ اقبال، نیاز فتح پوری، ابوالکلام آزاد، جگر مرادآبادی، مولانا غلام رسول مہر، رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، پطرس بخاری، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر، مجنوں گورکھپوری، ن۔ م۔ راشد، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ اس ضمن میں اہم ہیں۔ بیسویں صدی کے ادیبوں میں اس حوالے سے ایک نام پریم چند کا بھی ہے کہ جن کے خطوط اُن کے دیگر ہم عصروں کے مکاتیب کی طرح نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

پریم چند[2] نے اپنے قلم کے ذریعے معاشرتی اور سماجی ناہمواریوں کو موضوع بناتے ہوئے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے مطلعِ ادب پر کم و بیش تیس برس حکمرانی کی۔ اس عرصے میں انھوں نے ناول، افسانے، مضامین اور چند ڈرامے بھی لکھے لیکن بطور ڈرامہ نگار اور نقاد انہیں وہ پذیرائی نہ مل سکی جو ایک ناول نگار اور افسانہ نگار کے طور پر اُن کے حصے میں آئی۔ پریم چند نے بہت سی اُردو، ہندی اور انگریزی تحریروں کا ایک زبان سے دوسری میں ترجمہ بھی کیا لیکن اُن کا یہ کام عوام کے ذہن کا اُس طرح سے حصہ نہ بن سکا جس طرح ناول اور افسانے اپنے متنوع موضوعات، تجربات و مشاہدات کی پختگی، گیرائی و گہرائی اور حقیقت نگاری کی بنا پر عوام و خواص کے ذہنوں پر غیر معمولی اثرات مرتب کرنے کا باعث بنے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہندوستان کی معاشی، سیاسی، طبقاتی، اقتصادی اور معاشرتی کشمکش کا ایک تاب ناک نقشہ پیش کیا۔ تہذیب و معاشرت کی اس طور پر عکاسی کا مقصد اپنے سماج میں آشا کی جوت جگانے کے علاوہ ادب کو معنویت، جامعیت اور مقصدیت کے نئے افق عطا کرنا بھی تھا۔

پریم چند پر اب تک جتنا بھی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا کام سامنے آیا ہے اُس میں بیشتر اور نسبتاً زیادہ اہم حصہ ہندوستان کے محققین و ناقدین کا ہے۔ پاکستانی محققین و ناقدین کے ماسوائے چند تنقیدی مضامین اور درسی نوعیت کی کتب یا پھر اُردو ناول اور افسانے کی روایت بیان کرتے ہوئے انھیں زیرِ بحث لانے کے علاوہ کوئی غیر معمولی نوعیت کا کام سامنے نہیں آیا۔ اس میں شک نہیں کہ پریم چند نے اُردو کے افسانوی ادب کی روایت کو فکر و فن کا وہ سرمایہ عطا کیا جو نہایت وسعت کا حامل ہے

لیکن افسانوی ادب کے دائرۂ کار سے باہر بھی پریم چند کی تحاریر کا وسیع ذخیرہ ان کے مختلف مضامین، اداریوں، تبصروں اور خطوط کی صورت میں موجود ہے جس طرف توجہ مفقود رہی ہے۔ پریم چند کی غیر افسانوی تحاریر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے باقاعدہ اجلاس منعقدہ (۱۹۳۶ء) میں دیے گئے خطبۂ صدارت کے علاوہ کسی اور تحریر کو اُن کے تصورِ فن کا احاطہ کرنے کے لیے مستند حوالے کے طور پر اہمیت نہیں دی گئی حالاں کہ اس خطبے کے بھی بہت سے نکات ایسے ہیں جن پر پریم چند اس سے پہلے اپنے خطوط اور مختلف اداریوں میں روشنی ڈال چکے تھے۔ پریم چند کے سوانحی حالات وواقعات کے ضمن میں بھی اُن کے خطوط جنھیں خالصتاً ذاتی نوعیت کی تحاریر کہا جاسکتا ہے، سے خاص استفادہ نہیں کیا گیا۔ پریم چند کے خطوط میں اُن کی کسمپرسی کی زندگی، معاشی دشواریوں، مختلف علاقوں کے اسفار اور قیام، احباب سے راہ ورسم، زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر اور فکر وفن کے مختلف پہلوؤں پر واضح اشارے ملتے ہیں۔ ان خطوط کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر مدن گوپال[۳] نے پریم چند کے خطوط جمع کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ لکھتے ہیں کہ:

> ''منشی پریم چند کے خطوط جمع کرنے کی کہانی بڑی دل چسپ ہے اس کام کی ابتدا لگ بھگ پچیس سال قبل اس وقت ہوئی تھی جب میں مرحوم کی زندگی اور تصنیفات پر انگریزی میں ایک کتابچہ لکھ رہا تھا۔ یہ کتابچہ ۱۹۴۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ منشی صاحب مرحوم کی صحیح تصویر پیش کرنے کی سمت یہ پہلا قدم تھا۔ اس سلسلے میں مجھے ان کے خطوط جمع کرنے کا خیال آیا اور میں نے پریم چند سے متعلق تمام ضروری ادب بھی پڑھا تا کہ وہ ذرائع دریافت ہوسکیں جن سے اس کام میں مدد ملے۔''[۴]

پریم چند کے خطوط کا اُردو مجموعہ مدن گوپال نے ۱۹۶۸ء میں ''پریم چند کے خطوط'' کے عنوان سے ترتیب دیا جو مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس سے پہلے وہ پریم چند کے خطوط ہندی زبان میں ''چٹھی پتری'' کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع کر چکے تھے[۵]۔ ''پریم چند کے خطوط'' میں کل ۲۶۰ مکتوبات کو زمانی ترتیب سے شامل کیا گیا ہے۔ بہت سے خطوط جو اُردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبان میں تھے، کا اُردو ترجمہ کر کے یہاں شامل کیے گئے ہیں اور ایسے خطوط کی بابت حواشی میں وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس مجموعے میں سب سے زیادہ خطوط پریم چند کے قریبی دوست دیانرائن نگم کے نام ہیں جن کی تعداد پچپن (۵۵) ہے جن میں سب سے پہلا خط ۳۰/جنوری ۱۹۰۵ء جب کہ آخری خط ۵/اگست ۱۹۳۶ء کا ہے۔ اس کے علاوہ جینندر کمار کے نام چوّن (۵۴)، امتیاز علی تاج کے نام پینتالیس (۴۵) اور بنارسی داس چترویدی کے نام اٹھارہ (۱۸) خطوط شامل ہیں۔ پریم چند کے سوتیلے بھائی مہتاب رائے کے نام سات (۷) جبکہ اُن کی دوسری بیوی شورانی دیوی کے نام آٹھ (۸) اہم خطوط بھی زمانی ترتیب سے شامل کیے گئے ہیں۔ پریم چند کے دیگر مکتوب الیہان میں خواجہ عبدالسلام منیجر 'زمانہ' پریس (۱۱ خطوط)، ونود شنکر ویاس (۹ خطوط)، اندر بساوڑا (۸ خطوط)، سری رام شرما (۶ خطوط)، کیشو رام سبھر وال (۵ خطوط)، حسام الدین غوری (۵ خطوط)، اُپندر ناتھ اشک (۴ خطوط)، اندر ناتھ مدان (۴ خطوط)، وشنو پربھاکر (۳ خطوط)، بھدنت آنند کوسلیاین (۲ خطوط) اور منشی درگارہ سہائے سرور، مولوی عبدالحق، اقبال اور ماسحر ہتگامی، آچاریہ نریندر دیو، مانک لال جوشی، بھگوتی پرساد باجپائی، اختر حسین رائے پوری، ایڈیٹر نیرنگ خیال اور منیجر دار الاشاعت شامل ہیں جن کے نام ایک ایک خط لکھا گیا۔ اس کے علاوہ بھی پریم چند کے بیسیوں خطوط جن کے بارے میں مدن گوپال کو کہیں سے معلومات حاصل ہوئیں، تک رسائی کی کوشش کی گئی لیکن دستیاب نہ ہوسکے۔ دستیاب خطوط کو اکٹھا کرنے کے بعد زمانی ترتیب سے مجموعے میں شامل کرنا ایک ایسا کام ہے جس

کے ذریعے پریم چند کی زندگی کے حالات اور افکار کے تغیر کو سمجھنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ خطوط کو ترتیب دینے کے حوالے سے مدن گوپال لکھتے ہیں کہ:

''خطوں کے حصول سے زیادہ مشکل کام ان کو ترتیب دینا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بہت سے خط خراب اور خستہ حالت میں تھے۔ بعض جلدی میں لکھے گئے تھے اور انھیں پڑھنا مشکل تھا۔ سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ بعض خطوں پر تاریخیں نہ تھیں۔ عام طور پر پریم چند تاریخ مہینہ اور سال میں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور چھوڑ جاتے تھے بعض اوقات تو جگہ کا ذکر بھی نہ کرتے تھے۔ پوسٹ کارڈ کی صورت میں تو ٹکٹ یا مہر کی مدد سے تاریخ کا اندازہ لگا لیا گیا لیکن لفافے میں بھیجے گئے خطوں سے یہ مدد بھی نہ مل سکی کیونکہ لفافے قدرتی طور پر پھینک دیے گئے تھے۔ پریم چند نے اپنے خطوں میں جابجا اپنی اُن کہانیوں اور مضامین کا ذکر کیا ہے جو رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ ایسے خطوں کی تاریخیں اور لکھنے کی جگہ ان خطوں میں درج اشاروں کی مدد سے دریافت کرنی پڑی۔''[۶]

پریم چند کے سوانحی حالات اور فکر کو سمجھنے میں ان خطوط کی اہمیت کو اکثر نظر انداز کر دیا گیا۔ کسی بھی ادیب کے افکار و تصورات کی اساس زندگی کے بارے میں اُس کے خاص نقطۂ نظر کا سرچشمہ ہوتی ہے سو اُس کے ادبی تصورات کا جائزہ لینے سے پیش تر بھی یہ ضروری امر ہے کہ زندگی کے بارے میں اُس کے نقطۂ نظر کو سمجھا جائے۔ پریم چند کی فکر کا بنیادی پہلو انسان دوستی اور حقیقت پسندی ہے اور ادب میں یہی پہلو انسان کی جیتی جاگتی روزمرہ زندگی کے حقائق کی عکاسی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ کوئی بھی انسانی عمل اُس وقت تک تکمیلیت کا درجہ نہیں پا سکتا کہ جب تک زندگی اور حقیقت کے اس جدلیاتی پہلو کو سمجھ کر انجام نہیں دیا جاتا جو مادی وسائل اور سماجی رشتوں سے عبارت ہے۔ پریم چند کا تصورِ حیات کھیل اور کھلاڑی کے اُس فلسفے پر مبنی ہے جس کا اظہار اُن کی بہت سی تحاریر میں ہوا ہے اور اس بات کا بھی دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس تصورِ حیات میں پریم چند کے ہاں عمر کے آخری حصے میں تغیر پذیری کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اسے یکسر تبدیل کر دیتی ہے۔ اپنے قریبی دوست دیا نرائن نگم کے بچے کی وفات پر تعزیت کی غرض سے لکھے گئے ایک خط مورخہ ۲۳/اپریل ۱۹۲۳ء میں پریم چند اس فلسفے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''کیوں ہم یہ خیال کریں کہ ہم سے تقدیر نے بے وفائی کی۔ خدا کا شکوہ کیوں کریں۔ کیوں اس خیال سے ملول ہوں کہ دنیا ہماری نعمتوں سے بھری تھالی کو ہمارے سامنے سے کھینچ لیتی ہے۔ کیوں اس فکر سے متوحش ہوں کہ قزاق ہمارے اوپر چھاپہ مارنے کی تاک میں ہے۔ زندگی کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اپنے اطمینانِ قلب سے ہاتھ دھونا ہے۔ بات دونوں ایک ہی ہے۔ قزاق نے چھاپہ مارا تو کیا؟ ہار میں سارے گھر کی دولت کھو بیٹھے تو کیا؟ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جبر ہے اور دوسرا اختیار۔ یہ قزاق زبردستی جان اور مال پہ ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن ہار زبردستی نہیں آتی۔ کھیل میں شریک ہو کر ہم خود ہار اور جیت کو بلاتے ہیں۔ قزاق کے ہاتھ لوٹا جانا زندگی کا معمولی واقعہ نہیں۔ حادثہ ہے لیکن کھیل میں جیتنا اور ہارنا معمولی واقعے ہیں جو کھیل میں شریک ہوتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ہار اور جیت دونوں ہی سامنے آئیں گی اس لیے اسے ہار سے مایوسی نہیں ہوتی۔ جیت سے پھولا نہیں سماتا۔ ہمارا کام تو صرف کھیلنا ہے۔ خوب دل لگا کر کھیلنا۔ خوب جی توڑ کر کھیلنا۔''[۸]

زندگی کے حوالے سے پریم چند کے ہاں اُمید پرستی کا یہ نظریہ اُن کے افسانوی ادب کا بھی موضوع رہا ہے۔ اُن کے خیال میں ہار اور جیت، نفع اور نقصان تقدیر کے ہاتھ ہے اور اس پر انسان کا کوئی اختیار نہیں۔ جس چیز پر انسان اختیار کا دعویٰ کر سکتا ہے وہ ہار اور جیت اور نفع اور نقصان کے لیے میدان میں اُترتا ہے اور تقدیر، جو اُس کا اصل حریف ہے، کے سامنے ہمت نہ ہارنے کا جذبہ ہی زندگی ہے۔ گویا تقدیر کو اپنا کام کرنے دیا جائے اور انسان اپنی مشاقی کا برابر مظاہرہ کرے۔ پریم چند نے شکوۂ تقدیر کو اطمینانِ قلب سے ہاتھ دھونے کے مترادف قرار دیا ہے لیکن اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں تقدیر جس سے نبرد آزما رہنے کی یہاں تلقین کی گئی ہے، کے سامنے پریم چند نے بھی گھٹنے ٹیک دیے۔ اپنے رسالہ 'ہنس' کے فروری ۱۹۳۲ء کے شمارے میں پریم چند نے 'میری کہانی' کے عنوان سے اپنی مختصر خودنوشت لکھی جس کے آخری کلمات ملاحظہ کریں:

> ''اب دیہات میں کچھ کام کرنے کی طبیعت ہوئی۔ پوندارجی کا دیہات میں ایک مکان تھا۔ ہم اور وہ دونوں وہاں چلے گئے اور چرخے چلانے لگے۔ ایک ہی ہفتہ بعد میری پیچش کم ہوگئی یہاں تک کہ ایک مہینے کے اندر بالکل صحت ہوگئی، مگر اس کے بعد میں بنارس چلا آیا اور اپنے دیہات میں بیٹھ کر پرچار اور ادبی خدمت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ غلامی سے نجات پاتے ہی نو سال کے پرانے مرض سے چھٹکارا پا گیا۔ اس تجربہ نے مجھے پوری طور پر ''قسمت پرست'' بنا دیا۔
> اب مجھے کامل یقین ہے کہ جو مالک کی مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان کی کوئی کوشش اس کی مرضی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتی۔''[۹]

زندگی کے بارے میں پریم چند کے کھیل اور کھلاڑی کے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے اسے بے عملی کا نمونہ قرار دیا ہے اور اُن کے فکری تضاد سے تعبیر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کا یہ تصورِ حیات عملی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے اندر وہی فکری تضاد اور تناقص ہے جس سے وہ آخر عمر تک پیچھا نہ چھڑا سکے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ پریم چند جیسا ادیب جو زندگی سے اس درجہ قریب رہا اور جو عام انسانوں کے دکھوں ان کی محرومی و مظلومی سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کی بہتری اور نجات ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا' زندگی کا ایسا مثالی تصور پیش کرتا ہے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پریم چند نے اپنے تصورِ حیات کی وضاحت کے لیے جس تشبیہ اور تمثیل سے کام لیا وہ اس کے لیے موزوں نہیں تھی۔''[۱۰]

زندگی کو ایک کھیل سمجھنا اور ہار جیت کا تصور کیے بغیر دل لگا کر کھیلنے کے فلسفے میں پریم چند نے درحقیقت اُس جمود کی مذمت کی ہے جو ایک فرد کی زندگی یا کسی بھی معاشرے کی مجموعی حالت میں زوال پذیری کے عنصر کو جنم دیتا ہے۔ اس ضمن میں وہ جس حرکیت کا پیغام دینا چاہتے ہیں اُس کے لیے اپنے اس فلسفے کے بیانیے میں موزوں تمثیل کا انتخاب کرنے سے قاصر رہے۔ جس کھلاڑی کو پریم چند نے حریف کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے رہنے کا مشورہ دیا ہے وہ ایک شکست کے بعد دراصل ہار اور نقصان کو جیت اور نفع میں بدلنے کی مطلوبہ خواہش، ہمت اور ہنر نہیں رکھتا گویا وہ ایسا کھیل پیش نہیں کر سکتا جس میں دل چسپی اور متاثر کرنے کی صلاحیت ہو اور جو غیر متوقع نتائج دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے کھیل سے وہ کلائمکس پیدا

نہیں ہوگا جس پر خود پریم چند نے ہمیشہ زور دیا ہے۔ کلائمکس کی یہ خصوصیت کہانی کی فضا میں پیدا ہونے سے وہ قاری کو آخری سطر تک اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے بصورتِ دیگر وہ دل چسپی سے عاری ہوگی۔ پریم چند کے کھلاڑی کے فلسفے کا یہی کمزور پہلو زندگی کے آخری برسوں میں 'قسمت پرستی' کے کامل عقیدے پر منتج ہوتا ہے وگرنہ اُن کی تحریروں کا مطالعہ ایک ایسی شخصیت کا نقشہ پیش کرتا ہے جس نے زندگی کی دشواریوں اور محرومیوں سے نجات پانے اور سماج کے ساکت ڈھانچے میں ایک ناگزیر حرکت پیدا کرنے کے لیے کوشش جاری رکھی۔ ادب کے بارے میں انھوں نے ہمیشہ ایک ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا اور اسے معاشرے کی تہذیبی، معاشرتی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی اقدار میں بہتری لانے کا آلۂ کار خیال کیا۔ ہندوستان میں سامراجی تسلط کے دور میں پریم چند وہ پہلے تخلیق کار ہیں جنھوں نے معاشرتی اور اقتصادی مسائل کی طرف توجہ مبذول کرانے والے ادب کی تخلیق اور ترویج پر زور دیا۔ اس ضمن میں دیانرائن نگم کے نام اُن کا ایک خط نہایت اہم ہے جس میں انھوں نے دیانرائن نگم کے لیے 'بھائی جان' یا 'برادرم' کا وہ لقب جو عموماً استعمال کرتے تھے، ترک کر کے ''جناب ایڈیٹر 'زمانہ'' کہہ کر مخاطب کیا۔ اس خط محررہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اُمید ہے جناب کو ناگوار نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں جب کہ گوناگوں اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل ہماری تمام تر توجہ کے مستحق ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ 'زمانہ' کا قریب قریب ایک پورا نمبر محض آتش کے کلام کے تبصرہ کی نذر ہو گیا۔ میں آتش کی استادی کا قائل ہوں۔ لکھنوی شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلتاً کم ہے۔ مگر پھر بھی اتنا زیادہ ہے کہ بہ استثنا ان حضرات کے جو لکھنوی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور ابتذال جن کی کیفیتِ ثانی ہو گئی ہے اور سبھی طبائع کا موجودہ معیار اور ذوقِ صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔
>
> لٹریچر کا موضوع ہے تہذیبِ اخلاق، مشاہدہ، جذبات، انکشافِ حقائق اور واردات و کیفیاتِ قلب کا اظہار۔ جو شاعری حسن و عشق کو آئینہ و شانہ، خنجر و محشر، سبزہ و خط، دہن و کمر کے تخیل سے ملوث کرتی ہو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آج ہم اس کا ورد کریں۔ جن کی اُفتادِ طبع اس رنگ کی ہے۔ انہیں اختیار ہے۔ آتش یا ناسخ، رند اور امانت کا وظیفہ پڑھیں لیکن 'زمانہ' کے مختلف الطبائع ناظرین کو اس وِرد و وظیفہ میں شریک ہونے کے لیے مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے۔''[۱۱]

پریم چند نے جذبات کے دھندلکوں میں سے گزر کر انکشافِ حقائق کا وہ عمل بطریقِ احسن انجام دیا جس کی جانب درج بالا اقتباس میں توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال اُن کا معروف افسانہ 'کفن' ہے۔ مشاہدے اور تجربے کی پختگی اور نفسیاتی حقیقت پسندی نے اس کہانی کو اُردو کے افسانوی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت عطا کی ہے۔ اپنی کہانیوں میں نفسیاتی کیفیات کو معاشرے کے حقیقی کرداروں کے ذریعے پیش کرنے کے فن کا اظہار پریم چند نے بعض خطوط میں بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں دو مختلف خطوط سے اقتباسات ملاحظہ کریں۔ ایڈیٹر 'نیرنگِ خیال' کے نام خط محررہ فروری ۱۹۳۴ء میں لکھتے ہیں:

> ''میرے قصے ہمیشہ کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں، ان میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔

زمین تیار ہونے پر میں کریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔''۱۳؎

اس حوالے سے دوسرا خط اندرناتھ مدان ۱۴؎ کے نام محررہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۳۵ء ہے جس میں یوں رقم طراز ہیں:

''میرے افسانے کی بنا ہمیشہ نفسیاتی ہوتی ہے۔۔۔۔ میرے اکثر کردار حقیقی زندگی سے لیے گئے ہیں گو ان کی اصلیت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ جب تک کردار کی بنیاد حقیقت پر مبنی نہ ہو وہ غیر حقیقی، غیر یقینی اور ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔''۱۵؎

ادب کو حقیقت پسندی کی جن روایات سے پریم چند نے روشناس کرایا وہ آج بھی اس کا بلند ترین معیار ہیں۔ اپنے عہد کی معاشرت سے گہری آگہی رکھنے والے اس تخلیق کار نے زندگی کے جذبات کی مصوری کا کام نہایت ذمے داری کے ساتھ انجام دیا۔ اپنے مقاصد کی فنی تعمیر میں پریم چند کس حد تک کامیاب رہے اس کا اندازہ تو اُردو اور ہندی میں اُن کی بے شمار تصانیف کے مطالعے سے ہی لگایا جا سکتا ہے لیکن اُن کے مقاصد کی بلندی پر کوئی دوسری رائے موجود نہیں۔ پریم چند کی فکر کے سوتے اُس عہد کے ہندوستان کی طبقاتی کشمکش، معاشرتی زندگی کی پیچیدگیوں اور محرومیوں اور غلامی و پستی سے نجات کا شعور پیدا کرنے، ایسے پہلوؤں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے زمانے میں پیداواری وسائل میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہونے سے بہت سے نئے طبقات ابھر کر سامنے آئے اور مسائل میں اضافے سے ہندوستان کی تہذیبی زندگی میں بھی کشمکش پیدا ہوئی۔ اس صورت حال میں پریم چند ہی اُس دور کا واحد تخلیق کار دکھائی دیتا ہے جس نے 'تخیل پسندوں' کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے عہد کی مجموعی تصویر کو کہانی کے رُوپ میں پیش کیا تاکہ زندگی زیادہ نمایاں ہو کر اور بہتر صناعی کے ساتھ سامنے آسکے۔ اس آدرش کو پریم چند کی تخلیقات میں عام فہم زبان اور سادگی و سلاست ایسی خصوصیات نے بھی پروان چڑھایا۔ جس حقیقت نگاری کی ترویج پر انھوں نے ہمیشہ زور دیا اُس کے لیے اسلوبِ بیان کی سادگی کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ بات آسانی کے ساتھ قاری تک پہنچ سکے کیوں کہ فکر کے اظہار میں نئی بندشیں اختراع کرنے اور رنگ آمیزی سے معنویت، جامعیت اور قطعیت بڑی حد تک متاثر ہوتی ہے۔ امتیاز علی تاج ۱۶؎ کے نام ایک خط محررہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۲۱ء میں پریم چند نے رنگین نویسوں اور ان کی تحریروں کو پذیرائی دینے والے رسائل پر تنقید کرتے ہوئے اپنے عہد کے مسائل کی عام فہم بیان میں عکاسی پر زور دیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''میں وہ زبان نہیں لکھ سکتا جس کا آج کل کے رسالوں میں نمونہ نظر آتا ہے اور جس کا پیش رو اگر کوئی ایک شخص نہیں تو آگر کا 'نقاد' ہے۔ اس رنگ کا عنصر ہے، سیدھی سی بات تشبیہات اور استعارات میں بیان کرنا۔ میں اس رنگ کی تقلید سے قاصر ہوں۔ تاجور صاحب بھی اس رنگ کے مقلد تھے اور معاف کیجئے گا۔ حضرت بیدل بھی اس کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ ایسے رنگین نویسوں کو میری روکھی پھیکی تحریر کیا پسند آئے گی یہ محض آپ کا اصرار ہے جس نے مجھے مخزن کے لیے قلم اُٹھانے پر مجبور کیا۔ علاوہ ازیں میں بھی ترکِ موالاتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں بھی آج کل وہی مسائل گونجا کرتے ہیں۔ قصوں میں وہی خیالات جھلکتے ہیں۔ اور ادبی رسائل میں ان کی گنجائش نہیں۔''۱۷؎

پریم چند نے اپنی تخلیقات میں بناوٹ اور رنگ آمیزی سے پہلو تہی کر کے ذاتی مشاہدے اور تجربے کو فطری انداز

میں قاری کے سامنے پیش کیا۔ اُن کے خیال میں یہی فضا تحریر میں تاثیر پیدا کرنے کا وسیلہ ہے۔ فکر کا اظہار جس قدر فطری مناسبت رکھتا ہو قاری کے ذہن میں اتنا ہی بہتر انداز میں محفوظ ہونے کی صلاحیت لیے ہوگا۔ ایڈیٹر 'نیرنگِ خیال' کے نام خط محررہ فروری ۱۹۳۴ء میں پریم چند نے کسی تحریر کی ادبیت کو فطرت سے قربت پر منحصر قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ادب کے ہر شعبے کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے۔ نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔''[۱۸]

پریم چند کے خطوط کے مطالعے سے ایک بڑی دل چسپ بات یہ سامنے آتی ہے کہ وہ ہندی کے اپنے ہم عصر ادیبوں کی نسبت اُردو کے تخلیق کاروں سے زیادہ متاثر تھے۔ اُنھوں نے کئی جگہوں پر اس خیال کا برملا اظہار کیا کہ ہندی زبان کے لکھاریوں میں اپنے عہد اور زندگی سے لگاؤ اور اُمید کا رویہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے جبکہ اُردو کا تخلیق کار اسی فلسفے پر قوم کی تعمیر کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اُردو زبان کے ادب میں جس وسیع النظری کا مظاہرہ اُس دور میں دیکھنے کو ملا وہ بلاشبہ غیر معمولی تھا۔ ایک طرف اقبال ایسا شاعر اپنی قوم کو نئے سانچوں میں ڈھالنے میں کوشاں تھا تو دوسری طرف ترقی پسند تحریک پَر تول رہی تھی جس نے اُردو زبان کو اعلیٰ معیار کے نثری اور شعری ادب کا بیش قیمت سرمایہ عطا کیا۔ مقامی سطح پر نو آبادیاتی محکومی، نسلی تفریق اور سیاسی جبر کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کے رویے پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آئے۔ اُردو کے ادیبوں میں ایک طبقہ اس کے برعکس سوچ رکھنے والا بھی موجود تھا اور ادب کو روایت کی تقلید میں آگے لے کر چل کر رہا تھا لیکن اُن کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ ادب کو قومی آزادی کی اجتماعی تحریکوں سے جوڑ کر ادبی تخلیقات میں ظلم و بیداد کی طاقت کے خلاف آواز بلند کرنے میں اُس عہد کے اُردو زبان کے ادیبوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اپنے مقاصد کی تقویم میں انھوں نے ثقافتی انجمنیں قائم کرنے اور مختلف علاقوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کا کام برابر جاری رکھا تا کہ مختلف موضوعات پر مباحثوں اور مذاکروں سے نئی راہوں کا تعین ہو سکے۔ پریم چند نے اسی بنا پر اُردو کے ادباء کی تحسین میں اپنے ایک خط بنام بنارسی داس چترویدی ۱۹ محررہ ۱۸/مارچ ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے:

''مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ 'وشال بھارت' اب بھی گھاٹے میں جا رہا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ پہلا ہندی اخبار' جسے ہندی کا سب سے اعلیٰ ماہنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی یہ حالت ہو۔ کیا یہ ہماری ترقی یافتہ ذہنیت کا معیار ہے؟ اُردو کے اخبار بازی لیے جا رہے ہیں۔۔۔۔ یقیناً اُن کا ادبی ذوق بہتر ہے۔ وہ حوصلہ افزائی کرنا جانتے ہیں۔ ہندی شاعری ابھی تک انفرادی اور جذباتی ہے۔ ہماری شاعری! اس جدوجہد کی آئینہ دار ہے جو ہمیں زندگی میں درپیش ہے۔ نہ اس میں کوئی تڑپ ہے نہ ہی یہ زندگی بخش ہے۔ یہ آپ کو مایوس بنا سکتی ہے اور کچھ نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمام شاعروں پر یاس کا فلسفہ کیوں طاری ہے۔ اُردو کے شاعروں کا رویہ فلسفیانہ، حقیقت پسندانہ اور رجائیت پر مبنی ہے۔ ان کے نصف درجن شاعر مسلم قوم کو اخوت، مساوات اور جمہوریت کے لیے اُصولوں کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ مسلمان شاعر کمیونسٹ ہے' اقبال تک۔''[۲۰]

پریم چند کی فکر کے اس پہلو کو سمجھنے کے لیے بنارسی داس چترویدی کے نام اُن کا ایک اور خط نہایت اہم ہے جس میں اُس دور کے ادب کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے چند تجاویز بھی دی گئی ہیں۔ اس خط محررہ ۳۱/مارچ ۱۹۳۶ء سے دو اقتباسات ملاحظہ کریں:

''جب تک ہم دوسری زبانوں کے مصنفوں سے میل جول پیدا نہ کریں، ان سے دوستی نہ بڑھائیں، ان سے ادبی مسائل پر روشنی ڈالنے کو نہ کہیں، تبادلۂ خیالات نہ کریں، ایک دوسرے کی تحریروں کا مقابلہ نہ کریں ہم وسعتِ نظر اور ذہنی ہمہ گیری کیسے پیدا کر سکتے ہیں جو ادبی کارکنوں کے لیے ازبس ضروری ہے۔ یورپ میں بین الاقوامی ادبی کانفرنسیں ہوتی ہیں جن میں ادب سے متعلق ہر قسم کے موضوع پر بحث کی جاتی ہے۔ اور یہاں ہم نے اب تک دوسری زبانوں کے مصنفوں سے بھائی چارہ قائم کرنے کی کوشش تک نہیں کی۔ اُردو والوں کی ثقافتی انجمنیں ہیں۔ ان کے ملنے جلنے سے ہمیں اپنی خامیاں نظر آتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے انہیں زیادہ سوشل اور ہمدرد پایا ہے۔''[۲۱]

''بڑھتے ہوئے اختلافات کو کیسے مٹایا جائے۔ یہ سیاسی لوگ بڑے مایوس کن ہیں۔ آپ ان سے وسیع النظری کی توقع نہیں کر سکتے۔ اس سلسلہ میں مصنفوں ہی کو رہنمائی کرنا ہوگی اور وہ مخالف گروہوں میں رہنے کی بجائے ایک دوسرے کے دوست بن کر یہ کام بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں۔ ہندوستانی سبھا کے جلسے دو ہفتے میں ایک بار ہوں گے۔ جن میں ادب اور لسانیات سے متعلق موضوعوں پر تقریریں ہوا کریں گی۔ مختلف زبانیں بولنے والے سامعین کے سامنے مقرروں کو بہت زیادہ ادبی رنگ اختیار کرنے کی خواہش کو دبا کر ایسی زبان استعمال کرنی ہوگی جسے سب ہی سمجھ سکیں۔ اگر ہم ملک کے تمام اہم ثقافتی مرکزوں پر ایسے جلسے منعقد کرا سکیں تو تنگ نظری اور علیحدگی پسندی کے موجودہ رجحان کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اور صرف اسی حالت میں ہمارا ادب زیادہ مکمل اور مالا مال ہو سکتا ہے۔''[۲۲]

کسی بھی سماج میں ہمہ وقت دو بڑے طبقے سرگرم ہوتے ہیں اور ان میں مختلف نوعیت کے تضادات تغیرات کا باعث بنتے ہیں۔ ان دو طبقات میں ایک وہ ہوتا ہے جو موجود نظام کو بدستور قائم رکھنے پر مُصر ہو اور دوسرا وہ جو نظام میں تبدیلی کا خواہاں ہو۔ اوّل الذکر عموماً حکمران طبقہ ہوتا ہے جو طبقاتی کشمکش کی صورتحال برقرار رکھنا چاہتا ہے تاکہ ایک عام آدمی حکومتی معاملات میں مداخلت نہ کر سکے۔ یہ طبقہ فطری طور پر یاسیت کا شکار ہوتا ہے اور کسی بھی انقلابی تبدیلی سے ہمیشہ خائف رہتا ہے۔ پریم چند نے اپنے عہد کے ادیب کو اسی طبقے کی خواہشات کا شکار ہو کر جھوٹی عظمت کے لیے کسی کوشش سے باز رہنے پر زور دیا کہ اُن کی دانست میں اس کا مطلب موجودہ نظام کے سامنے سرنگوں ہونا ہے۔ ادیب کو علیحدگی پسندی کے کسی رویے کا شکار ہونے یا طبقاتی کشمکش کو ہوا دینے میں حکومتی مشینری کا حصہ بننے کے بجائے سماجی ارتقاء پر یقین رکھنا چاہیے اور تغیر پذیری جو ہر شے کی فطرت ہے، کو بنیادی تقاضے کا درجہ دینا چاہیے۔ صحیح معنوں میں کسی زبان کے ادب کی تکمیلیت اور ادیب کی عظمت اسی امر میں پوشیدہ ہے۔ بنارسی داس چترویدی کے نام خط محررہ یکم دسمبر ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں کہ:

”جھوٹی اور حقیقی عظمت کے درمیان تمیز کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ میں کسی ایسے عظیم شخص کا تصور نہیں کر سکتا جو موتی رولتا ہو۔ جب میں کسی ایسے شخص کو دیکھتا ہوں تو اس کے آرٹ اور علم و دانش کی میری نظر میں وقعت باقی نہیں رہتی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اُس نے خود کو موجودہ سماجی نظام کے سامنے سرنگوں کر دیا ہے جس میں دولت مند طبقہ قلم کی طاقت کو اپنی مقصد برآوری کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بہرحال میں کسی دولت مند شخص کی عظمت سے متاثر نہیں ہو سکتا۔“ ۲۳

یہاں پریم چند کی فکر کا مارکسی پہلو بڑے واضح انداز میں سامنے آیا ہے۔ وہ اس بات کا مکمل ادراک رکھتے ہیں کہ دولت مند طبقہ ہی دراصل کسی سماج کی معاشی بدحالی کا باعث ہوتا ہے۔ پیداواری وسائل پر اُن کے مکمل اختیار کی بدولت سماج کے عام آدمی کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ جس سماج میں برابری کی سطح پر وسائل کی تقسیم نہ ہو وہاں مخصوص طبقے کا تسلط قائم رہتا ہے اور عام آدمی کی زندگی پر اس کے اثرات محرومیوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ پریم چند کا موضوع اُس کے معاشرے کا یہی محروم اور محکوم انسان ہے جسے دولت مند طبقہ استحصال کا نشانہ بناتا ہے اور اُن کے خیال میں ہر لکھاری کو اپنا انفرادی کردار ادا کرتے ہوئے اس معاشرتی پہلو کی تصویر کشی کرنی چاہیے کیونکہ کسی سماج کی اس سے بڑی دوسری حقیقت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

"Premchand be'ieved that a writer has a social function to perform. He had adopted realism as a form in literature. To him realism in art was Adarshonmukhi Yatharthvad (idealistic-realisim) which had an important social function: to contribute to the transformation of society by creating an awareness about the existing conditions and by projecting and vision of the future. Premchand's creative efforts were strongly imbued with this social commitment, which perhaps found the best expression in the manner in which he treated the problem of popular classes (ubordinate sections of society) in this function." [24]

پریم چند کی فکر کو سمجھنے کے لیے جو چند اشارے اُن کے مکاتیب سے ملتے ہیں وہ بلاشبہ اہم ہیں لیکن کسی بھی تخلیق کار کی فکر کا صحیح معنوں میں مکمل احاطہ اُس کی تخلیقات کو سامنے رکھے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ پریم چند کی شخصیت اور فکر و فن پر بہت سا تحقیقی وتنقیدی سرمایہ موجود ہے لیکن اس کا بیش تر حصہ اُن کے افسانوی ادب پر ہونے والے کام پر مشتمل ہے۔ پریم چند کی غیر افسانوی تحریروں کو اُس طرح سے اہمیت نہیں دی گئی حالانکہ اُن کے خطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ افسانوی ادب سے ہٹ کر بھی بہت سے رسائل و جرائد میں وہ اداریے، تبصرے اور مضامین وغیرہ لکھتے رہے جن کے موضوعات اُن کے عہد کی سیاسی، سماجی،

معاشرتی اور اقتصادی صورتِ حال تھے۔ بہت سے خطوط میں پریم چند نے اپنی تخلیقات پر مختصراً تبصرہ کیا ہے اور ان پر مختلف احباب کی آرا کا جواب بھی دیا ہے۔ اُردو میں پریم چند کے خطوط کا یہ مجموعہ نامکمل ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندی میں اُن کے مکاتیب کے مجموعے ''چٹھی پتری'' کی دونوں جلدوں میں شامل خطوط کو بھی اُردو میں منتقل کیا جائے تاکہ پریم چند کی شخصیت اور فکر کے مزید گوشے وا ہو سکیں۔

حواشی وتعلیقات:

۱۔ برنی، مظفر حسین، سید، ۱۹۹۹ء، ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'' (جلد اول)، دہلی، اُردو اکادمی، ص ۲۵، ۲۶۔

۲۔ پریم چند (۳۱ر جولائی ۱۹۰۸ء۔ ۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء) کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ نواب رائے کے قلمی نام سے بھی لکھتے رہے۔ بنارس (انڈیا) کے ایک گاؤں ملہی میں پیدا ہوئے۔ کائستھ گھرانے سے تعلق تھا سو اِسی مناسبت سے منشی کہلاتے تھے۔ آٹھ سال کے تھے کہ والدہ (آنندی دیوی) اور سولہ سال کے تھے کہ والد (منشی عجائب لال) کا انتقال ہو گیا۔ بچپن میں ہی غربت سے پالا پڑ گیا تھا اور پھر تمام عمر اسی طرح تنگ دستی میں گزری۔ میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلے کے لیے کوشش کی لیکن کام یاب نہ ہو سکے۔ ملازمت کا آغاز ایک پرائمری اسکول میں مدرّس کی حیثیت سے کیا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ٹریننگ کالج الٰہ آباد سے جونیر انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان اول درجے میں پاس کرنے کے بعد الٰہ آباد کے ماڈل اسکول میں صدر مدرس ہو گئے۔ اسی زمانے میں لکھنے کا آغاز کیا بنارس کے ہفت وار ''آوازِ خلق'' میں اُن کا پہلا ناول ''اسرارِ معابد'' قسط وار شائع ہونا شروع ہوا۔ پریم چند کی پہلی شادی پندرہ سال کی عمر میں ہی ہو گئی تھی لیکن وہ کام یاب نہ ہو سکی۔ دوسری شادی شورانی دیوی سے ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد اُن کا تبادلہ کانپور ہو گیا اور یہیں سے ''زمانہ'' کے مدیر منشی دیا نرائن نگم کے ساتھ اُن کی دوستی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد زمانہ پریس کانپور سے اُن کی کہانیوں کا مجموعہ ''سوزِ وطن'' شائع ہوا جو سرکار نے ضبط کر لیا۔ اس دوران وہ ترقی پا کر وہ سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنے اور اُن کا تبادلہ مہوبہ (ضلع ہمیر پور) ہو گیا۔ یہاں قیام کے دوران بیمار پڑ گئے تو تبادلے کی درخواست دی۔ ضلع بستی میں اُن کا تبادلہ کر دیا گیا لیکن یہاں بھی صحت یاب نہ ہوئے اور مختلف اسکولوں کی انسپکشن کا کام مشکل ہو گیا سو درخواست دی کہ اُنھیں دوبارہ مدرس کے فرائض سونپے جائیں۔ چنانچہ آپ ضلع بستی کے ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ماسٹر ہو گئے۔ لکھنے کا کام برابر جاری رکھا اور اس وقت تک اُن کے چار ناول اور دو افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے تھے اور ملک کے ادبی حلقے اُن سے اچھی طرح روشناس ہو چکے تھے۔ پھر پریم چند کا تبادلہ گورکھپور ہو گیا۔ یہاں قیام کے دوران پریم چند کی ادبی شہرت کو ملک گیر حیثیت حاصل ہوئی کہ ''پریم پچیسی''، ''بازارِ حسن'' اور ''گوشۂ خلق'' اسی زمانے میں شائع ہوئے۔ اسی دوران میں انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں ترکِ موالات کی تحریک بھرپور طریقے سے چلائی گئی جس سے ہر طبقے میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ مہاتما گاندھی نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا، گورکھپور میں ایک بڑے جلسے سے انھوں نے تقریر کی جس سے متاثر ہو کر پریم چند نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور جبر کے خلاف فکری سطح پر بھرپور طریقے سے

سرگرم ہوگئے۔ مالی اعتبار سے کچھ مشکلات کا سامنا ہوا تو ۱۹۲۱ء میں ایک دوست کے مشورے پر مارواڑی ودیالے میں صدر مدرس ہو گئے لیکن نو مہینے کے بعد اس ملازمت سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۲۳ء میں بنارس میں سرسوتی پریس قائم کیا جو معاشی حالات میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہ لا سکا۔ پریس کے معاملات کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں کچھ ملازمتیں بھی اختیار کیں۔ ۱۹۲۹ء میں کچھ عرصہ ہندی ماہنامے ''مادھوری'' کے مدیر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں سرسوتی پریس سے اپنا ایک پرچہ ''ہنس'' کے نام سے جاری کیا جسے بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور ہفت روزہ پرچہ ''جاگرن'' بھی نکالتے رہے۔ ان دونوں پرچوں نے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی فضا کی بھرپور عکاسی کی۔ ۱۹۳۴ء میں مالی مشکلات کے پیشِ نظر بمبئی کی سینی ٹون فلم کمپنی میں بھی کچھ عرصہ ملازمت کی اور ایک فلمی کہانی ''The Mill'' لکھی جسے کمپنی نے پسند نہ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں یہ ملازمت چھوڑ کر بنارس واپس آ گئے اور اپنا ناول ''گئودان'' مکمل کر کے شائع کرایا جسے نہایت شہرت ملی۔ ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر کی فرمائش پر کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے باقاعدہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت کی اور ایک خطبہ دیا جسے بے حد اہم جانا جاتا ہے۔ ادبی اُفق پر پریم چند اُردو اور ہندی کے مقبول ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُردو میں ان کے ناول ''میدانِ عمل''، ''گئودان''، ''بازارِ حسن''، ''غبن''، ''نرملا'' اور ''گوشۂ عافیت'' جب کہ ہندی میں ''رنگ بھومی'' زیادہ مقبول ہوئے۔

۳۔ مدن گوپال ۲۲ راگست ۱۹۱۹ء کو ہانسی (ضلع حصار) میں پیدا ہوئے۔ سٹیفن کالج سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں بی ایس سی کیا۔ ۱۹۴۰ء میں سائنس کی تعلیم کو خیر باد کہنے کے بعد پریم چند کی مختصر سوانح لکھنے کے کام کا آغاز کیا۔ اسی سال پنجاب یونیورسٹی لاہور سے صحافت میں ڈپلومہ کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' لاہور کے نائب مدیر ہو گئے۔ ۱۹۴۴ء میں بمبئی سے شائع ہونے والے روزنامہ "The Morning Standard" کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ اسی دوران اُن کی پہلی تصنیف ''پریم چند'' منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب پریم چند کی شخصیت اور فن پر کسی بھی زبان میں پہلی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں وہ ادبی تنظیم PEN میں شریک ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مدن گوپال بمبئی کے مذکورہ اخبار کے لندن میں نمائندے کے طور پر خدمات انجام دینے کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ وہاں اپنی صحافتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ادبی حوالے سے بھی سرگرم رہے۔ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان واپس آئے اور "India as a World Power" کے عنوان سے ہندوستان کی خارجہ پالیسی پر ایک کتاب لکھی جو اپنے موضوع پر ہندوستان سے شائع ہونے والی پہلی کتاب تھی۔ اُسی دور میں ایک ہی وقت میں کم و بیش بارہ اخبارات میں کالم لکھتے رہے اور بعد ازاں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء میں اطلاعات و نشریات کی وزارت سے وابستگی کے بعد مختلف سرکاری عہدوں پر رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد صحافت کے میدان میں واپس آئے اور چندی گڑھ سے شائع ہونے والے اخبار ''دیا نک تر بھون'' کے مدیر ہوئے۔ کچھ عرصہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔ پیشہ وارانہ اُمور سے ہٹ کر مدن گوپال کو ہندوستان میں پریم چند کے حوالے سے استناد کا درجہ حاصل ہے کیوں کہ پریم چند پر نہ صرف پہلی تصنیف اُن کی تھی بلکہ اس

موضوع پر تحقیق وتنقید کا ہندوستان میں سب سے زیادہ کام بھی مدن گوپال کا سامنے آیا ہے۔ پریم چند کی بہت سی نایاب تحریروں کو اکٹھا کر کے ''کلیاتِ پریم'' اُردو اور ہندی میں ۲۴ جلدوں میں شائع کرا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر اُن کی پندرہ طویل ومختصر تصانیف سامنے آچکی ہیں جو اُردو اور ہندی کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی ہیں۔ پریم چند پر ان تصانیف کے علاوہ مختلف موضوعات پر بیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن کی خودنوشت سوانح ''پریم چند کے جیون کار کی آتما کتھا'' کے عنوان سے ۱۹۹۴ء میں الٰہ آباد سے شائع ہوئی۔ مدن گوپال کو اُن کی خدمات پر پترکار شرومانی ایوارڈ، میتری شری ایوارڈ، بھارتندرو ہریش چندرا ایوارڈ اور اُردو اکادمی دہلی ایوارڈ کے علاوہ بہت سے اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔

۴ گوپال، مدن، جون ۱۹۶۸ء، ''پریم چند کے خطوط''، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ص ۵۔

۵ ''چٹھی پتری'' کے عنوان سے پریم چند کے خطوط کو دو جلدوں میں مدن گوپال اور پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے نے ترتیب دیا۔ یہ دونوں جلدیں پہلی دفعہ ۱۹۶۲ء میں ہنس پرکاشن، الٰہ آباد سے شائع ہوئیں۔

۶ ''پریم چند کے خطوط''، ص ۸، ۹۔

۷ دیانرائن نگم (۲۲/مارچ ۱۸۸۲ء۔ ۲/نومبر ۱۹۴۲ء) کانپور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تعلق کائستھ گھرانے سے تھا۔ اُردو، فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۰۳ء میں کرائسٹ کالج کانپور سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ گھر والوں کی وکالت کی تعلیم حاصل کرانے کی خواہش کو ترک کر کے نومبر ۱۹۰۳ء میں ادبی رسالے ''زمانہ'' کی ادارت اختیار کی۔ اُن سے پہلے اس رسالے کے مدیر منشی شیودیو برت لال ورمن تھے۔ ''زمانہ'' نے دیانرائن نگم کی زیرِ ادارت اُنتالیس سال تک ہندوستان میں علم وادب کی خدمت کا کام انجام دیا۔ دیانرائن نگم آخری دم تک ہر قسم کے حالات میں یہ رسالہ باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ اشاعت کے کام میں بعض اوقات انھیں کافی خسارہ بھی اُٹھانا پڑتا اور ثروت مند دوستوں کی طرف سے اس خسارے اور پچھلے تمام نقصانات پورے کرنے کی اس شرط پر کہ وہ ''زمانہ'' کو دیوناگری رسم الخط میں شائع کریں، پیش کش بھی ہوتی رہی لیکن انھوں نے ہمیشہ اس پیش کش کو رد کیا۔ ''زمانہ'' کے علاوہ ہفتہ وار ''آزاد'' بھی جاری کیا۔ دیانرائن نگم کی وفات کے بعد ''زمانہ'' کی ادارت کے فرائض اُن کے بیٹے منشی سری نرائن نگم انجام دیتے رہے اور یہ رسالہ جون ۱۹۴۹ء تک تواتر سے شائع ہوا۔ دیانرائن نگم ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات پر ''رفتارِ زمانہ'' اور ''علمی خبریں اور نوٹس'' کے عنوانات سے ''زمانہ'' کے ہر شمارے میں تبصرہ کرتے رہے۔ دیانرائن نگم کی کچھ تحریریں ''مخزن'' میں شائع ہوئیں لیکن مختلف اداریوں اور تبصروں کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر تصنیف پیش نہ کر سکے۔ اُردو دنیا میں اُن کی پہچان ''زمانہ'' کے مدیر کی حیثیت سے ہے۔ پریم چند کے کانپور میں قیام کے دنوں میں دیانرائن نگم کے ساتھ ایسے دوستانہ مراسم ہوئے جو وفات تک قائم رہے۔

۸ ''پریم چند کے خطوط''، ص ۱۵۳، ۱۵۴۔

۹ ''مضامین پریم چند (مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس)، ۱۹۶۰ء، علی گڑھ، یونیورسٹی پبلشر، مسلم یونیورسٹی، ص ۳۲۔

۱۰؎ قمر رئیس، ڈاکٹر،، ۲۰۰۷ء،''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار''،دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،ص۳۶۹۔

۱۱؎ ''پریم چند کے خطوط''،ص۱۹۰،۱۹۱۔

۱۲؎ پریم چند کے اس خط میں مکتوب الیہ کے نام کی جگہ''بنام ایڈیٹر نیرنگِ خیال'' درج ہے۔جس دور میں یہ خط لکھا گیا اُس وقت ''نیرنگِ خیال'' کے ایڈیٹر حکیم یوسف حسن (۱۸۹۲ء۔۱۹۸۱ء) تھے۔یہ ادبی رسالہ ۱۹۲۳ء میں لاہور سے جاری ہوا اور اُس عہد کے ہندوستان میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی اہم جریدہ شمار ہوتا تھا۔حکیم یوسف حسن اس رسالے کی ادارت کے علاوہ کہانیاں بھی لکھتے رہے۔مختلف موضوعات پر آٹھ کتب کے مصنف ہیں۔حکیم یوسف حسن کی وفات کے بعد اس کی ادارت کے فرائض سلطان رشک انجام دیتے رہے۔

۱۳؎ ''پریم چند کے خطوط''،ص۳۰۱۔

۱۴؎ اندر ناتھ مدان ہندی کے معروف ادیب اور نقاد ہیں۔وہ پہلے اسکالر تھے جنھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ہندی زبان وادب میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ "Modern Hindi Literature: A Critical Analysis" کے عنوان سے اُن کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ۱۹۳۹ء میں مینورا بک شاپ، لاہور سے شائع ہوا۔اپنی اس کتاب میں انھوں نے ہندی ادب کے لکھاریوں کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جن میں سے ایک پریم چند بھی ہیں۔اسی مقالے کے سلسلے میں انھوں نے پریم چند کو کچھ خطوط بھی لکھے جن کے جوابی خطوط کو اپنے ضمیمے کا حصہ بنایا (دیکھیے مذکورہ کتاب کا صفحہ نمبر ۲۱۰ تا ۲۱۵)۔پریم چند پر اندر ناتھ مدان کی ہندی میں ''پریم چند: ایک وویچن'' اور ''پریم چند چنتن اور کلا'' کے عنوانات سے دو معروف تصانیف ہیں۔

۱۵؎ ''پریم چند کے خطوط''،ص۳۶۶۔

۱۶؎ امتیاز علی تاج (۱۹۰۰ء۔۱۹۷۰ء) لاہور میں پیدا ہوئے۔گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے آنرز کیا۔زمانہ طالب علمی سے ہی انگریزی ڈراموں کے تراجم کرنا شروع کیے۔۱۹۱۸ء میں ادبی رسالہ ''کہکشاں'' نکالا جو تین سال تک تواتر کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔۱۹۳۲ء میں شہرہ آفاق ڈرامہ ''انارکلی'' تصنیف کیا۔ایک عرصے تک ریڈیو کے لیے ڈرامے اور فیچرز لکھتے رہے۔لاہور ریڈیو سے ''پاکستان ہمارا ہے'' کے نام سے اُن کا پروگرام بہت مقبول ہوا۔ ''کہکشاں'' کے علاوہ دو اور رسالوں ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔فلمی کہانیاں بھی لکھیں۔آخری ایام میں مجلس ترقی ادب لاہور سے وابستہ رہے۔پریم چند کے ساتھ امتیاز علی تاج کی خط وکتابت ایک خاص عرصے تک رہی جس میں ''کہکشاں'' کی اشاعت کا دور زیادہ اہم ہے۔

۱۷؎ ترکِ موالات کی تحریک ہندوستان میں ۱۹۲۰ء میں انگریز سامراج کے خلاف بڑے بھرپور انداز میں چلائی گئی۔ اس کا مقصد سرسیّد دور کے بعد سے اُس وقت تک انگریز حکومت سے تعاون کرنے کی روش سے انحراف کرنا تھا،دوسرے لفظوں میں یہ تحریک عدم تعاون تھی۔انگریز حکومت کے بڑھتے ہوئے ظلم وجبر اور بالخصوص ۱۹۱۹ء میں ہونے والے واقعہ جلیانوالہ باغ نے اس تحریک کی راہ ہموار کی۔اس تحریک کے منشور میں تمام سرکاری اداروں،

عدالتوں اور کونسلوں سے رکنیت ختم کر کے قطع تعلق اختیار کرنا، تمام سرکاری اعزازات اور خطابات کو ترک کرنا اور انگریزوں کے ہر قسم کے مال کا بائیکاٹ کرنا وغیرہ شامل تھے۔ تحریک میں ہندوستان کے طلبہ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بائیکاٹ کر کے جامعہ ملیہ کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ ہزاروں ہندوستانیوں کو نوکریوں سے ہاتھ دھو کر فاقہ کشی کی زندگی گزارنا پڑی۔ جمعیت العلمائے ہند، خلافت کمیٹی اور نیشنل کانگریس نے عدم تعاون کے پروگرام کو منظور کرتے ہوئے اس کی بھرپور حمایت کی۔ اس تحریک کے پلیٹ فارم پر ہندوستان کی تاریخ میں پہلی (اور شاید آخری) دفعہ اتنے بڑے پیمانے پر ہندو مسلم اتحاد دیکھنے کو ملا۔ پریم چند نے اس تحریک کے دنوں میں ہی مہاتما گاندھی کی گورکھپور کی تقریر سن کر اپنی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

۱۸ ''پریم چند کے خطوط''، ص ۴۴۔

۱۹ ایضاً، ص ۳۰۳۔

۲۰ بنارسی داس چترویدی (۱۸۹۲ء۔۱۹۸۵ء) فیروز آباد، یو۔پی میں پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک برس (۱۹۱۳ء۔۱۹۱۴ء) فرخ آباد کے ایک اسکول میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اُس کے بعد چھے برس (۱۹۱۴ء۔۱۹۲۰ء) تک دہلی کالج میں اُستاد رہے۔ اُن کے تدریسی فرائض کا آخری دور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک تھا جب وہ گجرات ودیاپیٹھ میں رہے۔ بعد ازاں مدرّسی کی زندگی چھوڑ کر ادبی سرگرمیوں اور صحافت میں دل چسپی لینے لگے۔ جینیش شنکر ودیارتھی جیسے انقلابی اور معروف صحافی کے ساتھ اُن کا تعلق استوار ہونا بنارسی داس چترویدی کے لیے صحافت کی دنیا میں داخل ہونے کا پہلا زینہ تھا۔ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز انھوں نے رامانند چترجی کے معروف ہندی میگزین ''وشال بھارت'' جو اُس وقت کلکتہ سے شائع ہوتا تھا، کے مدیر کی حیثیت سے کیا اور اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اپنے دور کا نمائندہ ہندی میگزین بنا دیا۔ پریم چند کے ساتھ اُن کی خط و کتابت ''وشال بھارت'' کو بہتر سے بہتر بنانے اور اشاعت کی غرض سے تحریریں منگوانے کے سلسلے میں رہتی تھی۔ آج بھی ہندوستان کی ادبی و صحافتی تاریخ میں بنارسی داس چترویدی کی پہچان ''وشال بھارت'' کے مدیر کی حیثیت سے ہے۔

۲۱ ''پریم چند کے خطوط''، ص ۳۷۵، ۳۷۶۔

۲۲ ایضاً، ص ۳۷۸۔

۲۳ ایضاً، ص ۳۷۹۔

۲۴ ایضاً، ص ۳۷۰۔

۲۵. Dawar, Jagdish Lal, April-June1996, "Representation of Popular Culture in Premchand's Works", Social Scientist, Itanagar, Vol.24, Nos.4-6, P.109

۲۶ ترجمہ: پریم چند کے خیال میں ہر لکھاری کا ایک سماجی کردار ہوتا ہے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کو ادب کا ایک لازمی حصہ گردانا اور اُن کے نزدیک فن بھی ایک ایسی مثالی حقیقت پسندی ہے جو سماج میں وسیع پیمانے پر اپنا تاثر قائم کرسکتا ہے۔ یہ معاشرے کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں آگہی کے وسیلے سے معاشرتی تبدیلی میں اور مستقبل کی بصیرت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ پریم چند کی تخلیقی کاوشوں میں معاشرے کے ساتھ جڑت کا عنصر بہت نمایاں ہے یہی وجہ ہے کہ نچلے طبقے کے استحصال اور مسائل کو اپنے مشاہدے کی روشنی میں بہترین انداز میں پیش کرتے ہیں۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ احمد، انوار، (۲۰۰۷ء)، ''اردو افسانہ ایک صدی کا واقعہ''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۲۔ افراہیم، صغیر، (۱۹۸۷ء)، ''پریم چند ایک نقیب''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

۳۔ برنی، سید مظفر حسین، (۱۹۹۹ء)، ''کلیاتِ مکاتیب اقبال''، جلد اول، اردو اکادمی، دہلی۔

۴۔ تالا، رہتا نک، (۱۹۸۸ء)، ''پریم چند: کچھ نئے مباحث''، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔

۵۔ حامد بیگ، مرزا، (۱۹۹۱ء)، ''اردو افسانے کی روایت''، اکادمی ادبیات، اسلام آباد۔

۶۔ حسین، احتشام، (۱۹۶۱ء)، ''تنقید اور عملی تنقید''، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ۔

۷۔ خورشید الاسلام، (۱۹۷۷ء)، ''تنقیدیں''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، تیسری اشاعت، علی گڑھ۔

۸۔ رئیس، قمر، (۲۰۰۷ء)، ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

۹۔ رئیس، قمر (۱۹۶۰ء)، ''مضامینِ پریم چند''، یونیورسٹی پبلشر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۱۰۔ فتح پوری، فرمان، (۲۰۰۰ء)، ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۱۔ فیروز سنز، (۲۰۰۵ء)، ''اردو انسائیکلو پیڈیا''، فیروز سنز، چوتھی اشاعت، لاہور۔

۱۲۔ قاسم محمود، سید، (۲۰۰۲ء)، ''انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا''، الفیصل ناشران، لاہور۔

۱۳۔ گوپال، مدن (۱۹۶۸ء)، ''پریم چند کے خطوط''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔

14. "Modern Hindi Literature[A Critical Analysis]" by Inder Nath Madaan, 1939, The Minerva Book Shop, Lahore.

15. "Social Scientist", April-June1996, Department of History, Arunachal University, Itanagar, Vol.24, Nos.4-6,

16. The encyclopaedia of Indian Literature, Vol 2.

17. Http://www.madangopal.co.in/, August23,2010,4:15PM